مستشرقین کا اسلوبِ سیرت نگاری اور مولانا عبدالماجد دریابادی

پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی، شعبۂ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، علامہ اقبال کیمپس، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Abstract

The orientalists have been writing on Islam, Orient and the Holy Prophet (PBUH) for a good many centuries. It is very unfortunate, however that Islam and the Prophet of Islam have been the most misunderstood ones in the western intellectual sphere. The Prophet has been maligned shamelessly and has been dubbed as impostor and the "renegade cardinal" etc. etc. and the Holy Quran merely a book of borrowings from the earlier revealed religions i.e., Judaism and Christianity.

Abdul Majid Daryabadi, taking stock of some positive contributions of the Orientalists has also explicated the real nature of Orientalism, coloured as it is with centuries-old prejudices, misgivings and misunderstandings of the West regarding Islam and the Holy Prophet. He is of the view that beneath the shining veneer of the orientalistic writings, lies the dark picture, portrayed in somber and dismal colours to tarnish not only the unique personality of the Prophet but also to sow the seeds of dissension in a subtle manner among the Muslim Ummah on basis of colour, creed or nationalism etc. etc. Darayabadi has goaded the ulema of the Muslim Ummah to rise against the mighty challenges of the orientalists and try to combat the prejudices and the misgivings regarding Islam and the Prophet of Islam. This according to Darayabadi, calls for concerted efforts on the part of the ulema and intellectuals of the Ummah to highlight the real face of Islam and the Prophet which is, of course, nothing but a blessing par excellence for the whole of humanity.

اسلام اور حضور اکرم a صدیوں سے اہلِ مغرب کے لیے موجبِ توجہ رہے ہیں اور اس کے چند در چند اسباب ہیں۔ اکیسویں صدی بھی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اسلام، اہلِ اسلام اور نبیؐ اسلام کے تواتر کے ساتھ ذکر سے مملو ہے گو کہ یہ ذکر اہلِ مغرب کے ہاں پہلے اور اب بیشتر برنگِ دیگر رہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ خلیجی جنگ اور ستمبر ستم گر کے بعد تو وہاں اب ''اسلاموفوبیا'' اور ''اسلاموفاشزم'' جیسی منفی اصطلاحات بھی وجود میں آ چکی

ہیں۔ ایک مدت سے مغرب کی تہذیب جدید میں ''استشراق'' بطور ایک فن اور پیشے کے ظہور میں آ چکا ہے۔ دراصل مذہبِ عیسائیت کے بعد سب سے بڑے اور آخری سماوی دین کے طور پر ظہور کا دعویٰ کرنے والا نظام حیات و کائنات .....اسلام .....عیسوی دُنیا اور اس کی دانشوری کی توجہ جذب کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا مگر افسوس یہ ہے کہ ''استشراق'' کا آغاز جس نیت سے کیا گیا اس کے نتیجے میں خشتِ اوّل سے ثریا تک دیوار کی کجی، تعصب کے خمیر میں گندھی اور دشنام و دجل کی گچ کاری سے داغ داغ نظر آتی ہے اور دجل، فریب کاری، تعصب اور تنگ نظری کا یہ سلسلہ اس اکیسویں صدی میں بھی جاری ہے۔ اسلام اور نبی اسلامؐ کے بارے میں جس پہلے قابلِ ذکر شخص نے اس افسوس ناک مہم کا آغاز کیا وہ بارہویں صدی عیسوی کا پیٹر- دی وینرایبل Peter__ The Venerable ہے مگر اُس کے بعد اِسے زیادہ منصوبہ بندی اور قوّت کے ساتھ جس شخص نے شروع کیا، وہ ایک مشہور پادری ریمنڈلل LULL تھا، جس نے اُس زمانے کے پوپ کی اشیر باد سے مغربی دانشگاہوں میں عربی اور علوم اسلامی کی تعلیم کا اجراء کیا۔ مقصود یہ تھا اسلام کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کی جاسکیں تا کہ بقول اس کے نہ صرف اس نئے ''کفروارتداد'' (اسلام، خاکم بدہن) کا مقابلہ کیا جاسکے بلکہ اس دین کے گمراہ مقلدین کو ''عیسائیت'' کی روشنی دکھائی جاسکے[۱]۔ اس لیے ریمنڈلل کو یورپ میں علوم اسلامی کا بنیاد گزار کہا جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ریمنڈلل سے قاتل ریمنڈ ڈیوس تک بیشتر ایک ہی کہانی ہے۔ دجل، فریب، تباہ کاری، دشنام طرازی، رسوا سازی اور تقلیبِ حقائق کی۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ کہیں یہ دجل خوش نما عبارتوں میں لپٹا بین السطور جھلکتا ہے اور کہیں بالکل کھلا ہوا، حقایق کا منہ چڑاتا نظر آتا ہے۔ یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ ''استشراق'' کی زیادہ تر طاقت وتوانائی استعماری قوتوں کی مرہونِ منّت رہی ہے، اور یہ سلسلہ ریمنڈلّل سے ریورنڈ منٹگمری واٹ تک اور ولیم میور، اشپرنگر، سنوُک ہرگرونژے سے لے کر برنارڈ لیوس اور جوزف شاخت اور ان سے متاثر ہونے والے سرکاری مصنفین ہنٹنگٹن اور فوکویاما وغیرہ تک پھیلا نظر آتا ہے۔ عہدِ وسطیٰ کے یورپی عیسائی جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا عیسائیت کے بعد ظہور کرنے والے دین کو کفر وارتداد سمجھتے تھے۔ این میری شمل لکھتی ہیں کہ شاید اسی باعث حضور اکرمؐ کے باب میں اہل یورپ میں یہ اسطور پھیلائی گئی تھی کہ وہ خاکم بدہن ''باغی لاٹ پادری'' Renegade Cardinal ہیں[۲]۔ رہا استعمار واستشراق کا گٹھ جوڑ تو اس کی عبرت ناک تفصیل ایڈورڈ سعید کی معرکہ آرا کتاب ORIENTALISM میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اقبال نے کس قدر درست کہا تھا:

متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراولِ لشکر کلیسیا کے سفیر

ایسا نہیں ہے کہ مستشرقین کا ہر ہر فرد قابلِ رد ہے یا ان کی علمی، تحقیقی اور تدوینی خدمات کسی درجے میں بھی قابلِ توجہ نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ مغرب میں اسلام اور حضورؐ کے خلاف عہدِ وسطیٰ میں پروان چڑھنے والا تعصب اور جنون بعد کی صدیوں میں کم نہیں ہوا۔ ہوا اور ضرور ہوا مگر اکیسویں صدی کے آغاز میں اب پھر سے ایک نئی شدت کے ساتھ شعلہ فشاں اور زہر چکاں ہے۔

دراصل مستشرقین کے گروہ میں بیشتر وہ لوگ رہے ہیں جو پادری اور مشنری تھے۔ ان کا اسلام سے تعصب

قابلِ فہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مستشرقین کی حیران کن تحقیقات کی تہ میں، جو حواشی تعلیقات اور مصادر و مراجع کے بھاری بھرکم پن کے ساتھ قاری کو متاثر اور مرعوب کرتا ہے، ظن و تخمین اور ادعائیت کا ایک ایسا غیر علمی انبار لگا ہوتا ہے، جس کا کوئی ٹھوس ثبوت سرے سے فراہم ہی نہیں ہوتا۔ پھر مستشرقین کا سارا زور قرآن کے یہودی اور عیسوی منابع ثابت کرنے پر لگتا رہا ہے۔ مستشرقین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اہل اسلام کی نہایت بنیادی کتاب پر سے اعتماد اٹھا دینے کے نتیجے میں مسلمانوں کو فکری ہزیمت سے دوچار کرنا اور ان پر قابو پانا بہت آسان ہے۔ مستشرقین اس امر کا ادراک نہیں کرتے یا نہیں کرنا چاہتے کہ اگر قرآن کہیں کہیں صحفِ سابقہ سے مماثل ہے بھی تو اس کا سبب یہ نہیں کہ اس کا ذخیرۂ رشد و ہدایت و حکمت و صداقت، یہودیت اور عیسائیت سے اخذ کردہ ہے بلکہ یہ ہے کہ تمام مذاہب آسمانی کا منبع وحی الٰہی ہے۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ خالص مادہ پرستانہ ماحول میں پرورش پانے والے مستشرقین یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ قرآن ''تنزیل لفظی'' ہے اور ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایچ اے آر گب جو مستشرقین میں نسبتۃً معتدل عالم کے طور پر معروف ہے، بظاہر قرآن کے ''تنزیل لفظی'' ہونے کے بارے میں کوئی رائے نہیں دیتا مگر اس کی تحریر کے بین السطور سے صاف تشکیک آفرینی کی بُو آتی ہے۔ لکھتا ہے:

> "Whatever the psychological explanation may be, it is difficult to resist the conclusion that the term "revelation" was confined to those utterances which were not consciously produced and controlled by the prophet and seemed to him to have been put into his mouth from without."[۳]

مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۳-۱۹۷۷ء) نے جہاں ایک طرف استشراق کے بعض مثبت پہلوؤں کی تحسین کی، وہیں اس کے منفی پہلوؤں پر بھی شد و مد اور تواتر سے لکھا۔ اس ضمن میں ان کی بعض تحریریں مثلاً ''اسلام حریفوں کی نظر میں'' (سچ، ۲/اگست ۱۹۲۶ء)، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، نیا ایڈیشن (صدق جدید ۱۲/دسمبر ۱۹۵۸ء)، اسلام پر مستشرقین کی نظرِ کرم'' (۲۵/اکتوبر ۱۹۶۳ء)، سچی باتیں (صدق جدید یکم نمبر ۱۹۶۳ء)، ''سیرت نبویؐ اور علمائے فرنگ'' (مشمولہ سلطان ماحمدؐ) اور ''ایک مستشرقانہ اپج'' بڑی چشم کشا اور قابلِ توجہ ٹھہرتی ہیں۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ یورپ صلیبی جنگوں کے زمانے سے، جس میں اسے پے در پے شکستیں ہوئیں، اسلام کو اپنا اصل مدمقابل سمجھتا رہا ہے اور عیسوی حربی اتحاد کی خاطر اسلام اور پیغمبر اسلام کو بدنام کرتا رہا ہے۔ مولانا دریابادی کو اس کا بخوبی احساس تھا۔ وہ استشراقی حربوں اور مستشرقین کی نفسیاتی چالوں کا نہایت گہرا ادراک رکھتے تھے۔ مسلّمات اور یقینیات میں رخنہ اندازی، دھیمے اور خوشگوار لہجے کے ذریعے شیریں زہر چکانی اور تشکیک آفرینی مستشرقین کے مخصوص ہتھیار ہیں جن سے وہ اب تک کام لے رہے ہیں۔ ان پر مستزاد ان کا مادہ پرستانہ تصور حیات جس کی بنیاد نری کھری ایں جہانیت (This-worldiness) پر ہے۔ ان سب پر مولانا دریابادی کی گہری نظر تھی۔ ۱۹۲۶ء کی مسلم دنیا کے شدید آشوب کے تناظر میں یورپ کے تجسس، اضطراب اور اس کے ردعمل کا ذکر کرتے ہوئے وہ بعض اہم حقایق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''یورپ آج سے نہیں، مدت سے اپنا اصلی حریف اسلام ہی کو سمجھتا آ رہا ہے۔ جب تک کلیسا کی قوت قائم رہی اس وقت بھی اور اب جبکہ کلیسا کی جگہ مادیت نے لے لی ہے، اب بھی اہل فرنگ اپنا اصلی مدمقابل اسلام ہی کو سمجھ رہے ہیں۔ جو خطرہ انھیں توحید کے امانت داروں اور محمد عربیؐ کی امت کہلانے والوں سے لگا رہتا ہے وہ دنیا میں اور کسی سے نہیں۔ یہیں سے یہ ہے کہ دنیا کے ہر گوشے میں، دنیائے اسلام کی ہر جنبش پر، امتِ اسلامیہ کی ہر حرکت پر یورپ کی گہری نظر رہتی ہے اور پردۂ زمین پر اسلامی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس کی جاسوسی پر دانایانِ فرنگ کے پہرہ دار مقرر نہ ہوں۔ ہر نبض کی جنبش پر، ہر سانس کی حرکت پر یورپ کی سرگوشیاں ہیں۔ ہر ہر لمحہ وہ جانچتا ہے اور تولتا ہے، ٹٹولتا ہے اور اندازتا ہے کہ جس کو وہ اپنا اصلی حریف سمجھے ہوئے ہے اس کی زندگی کا پارہ اب چڑھاؤ یا اتار [کے] کس درجے پر ہے۔''[۴]

کیا ۱۹۲۶ء کی مولانا دریابادی کی یہ تحریر تقریباً ستر اکہتر برس بعد امریکہ سے شایع ہونے والی کتاب "Clash of Civilizations" کے اس اعلان کی تصدیق کنندہ نہیں کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اب عیسائی دُنیا کو اصل خطرہ صرف اسلام سے ہے ایسا خطرہ جسے ہنٹنگٹن ''سبز خطرے'' سے تعبیر کرتا ہے۔

''اسلام پر مستشرقین کی نظرِ کرم'' میں مولانا دریابادی جو کچھ فرماتے ہیں وہ مستشرقین کے سلسلے میں ان کے موقف ہی کی بخوبی وضاحت نہیں کرتا، مغرب کے ناقص تصورِ علم Episteme کی بھی قلعی کھولتا ہے:

''اسلامیات پر قلم اُٹھانے والے مستشرقین کی ایک جماعت کا رویہ تو ہمیشہ سے معاندانہ، مخالفانہ اور متعصّبانہ رہا ہے بلکہ بعض تحریریں تو کھلی ہوئی بدزبانی اور سب وشتم کی مثالیں ہیں، خصوصاً آج سے ڈیڑھ دوصدی قبل کی تحریریں- رفتہ رفتہ لب ولہجہ کی تلخی وخشونت میں اصلاح ہوتی گئی اور اب ان کی تنقیدیں عموماً نرم وغیر دل آزار زبان میں ہونے لگی ہیں لیکن جو مہذب وشیریں زبان لکھتے ہیں ان کے قلم سے بھی کبھی نہ کبھی کوئی ایسی بات نکل ہی جاتی ہے جو اسلام کے کسے عقیدے کی ہادم یا اسے پڑھنے والی نظر میں مشکوک ومشتبہ بنا دینے والی ہو اور ریسرچ کے معنی ہی تو ان کے ہاں ٹھہر گئے ہیں مسلمات ویقینیات میں شک وشبہ پیدا کرنا اور ان میں رخنے ڈالنا.....اس کی بنیاد ضروری نہیں کہ اسلام دشمنی ہی پر ہو۔ یقین کی جگہ بے یقینی، سکون کی جگہ مسلسل بے چینی اور اطمینان کی جگہ بے اطمینانی فرنگی ذہنیت کی سرشت میں داخل ہوچکی ہے اور اس کا اظہار ان کے سارے ہی علمی و''تحقیقی'' کاروبار میں ہورہا ہے۔''[۵]

اپنے ایک اور مقالے ''مستشرقانہ اپج'' میں مولانا دریابادی نے ان علما کی کم علمی اور خودفریبی پر اظہارِ افسوس کیا ہے جن کے خیال میں مستشرقین کا گروہ نظر انداز کر دیے جانے کے قابل ہے۔ اس ضمن میں مولانا نسبتہً غیر معروف فرانسیسی مستشرق جوزف شیلہود Chelhod کی اسلامیات کی ایک کتاب پر ہونے والے ریویو کے ضمن میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مقصود اس (تحریر) سے یہ دکھانا ہے کہ ہمارے ہاں کے جو علما اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ فتنۂ استشراق صرف دس بیس یا سو پچاس افراد تک محدود ہے یا صرف چند فرسودہ اور گھسے پٹے موضوع ہیں جن پر وہ اب تک لکھے چلے جا رہے ہیں، وہ کتنے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں ایسے شخص امریکا اور یورپ میں ہیں جو اپنی زندگیاں اسلامیات پر لکھنے لکھانے کی نذر کیے ہوئے ہیں اور ہالینڈ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، روس، اٹلی، کینیڈا، امریکا، سویڈن، لبنان وغیرہ میں بیسیوں نہیں پچاسوں بڑے بڑے مرکز ایسے قائم ہیں جہاں دن رات یہی کام ہو رہا ہے۔ بیسیوں رسالے سہ ماہی، چوماہی، چھے ماہی انھی موضوعوں پر نکل رہے ہیں اور عنوانات نت نئے نکلتے چلے آتے ہیں۔ خود اسی مقالے کو لیجیے، علوم متعارفہ کی طرح استدلال کا اوّلیں مفروضہ یا مسلمہ تو یہ ہے کہ حق وحقانیت، وحی والہام، منصبِ رسالت یہ تو سب ڈھکوسلے اور اوہام ہیں۔ اب آگے چلیے عرب میں ایک شخص (نعوذ باللہ) پیدا ہوتا ہے۔ آدمی فریس و دانا ہے۔ یہود اور نصرانیوں کی صحبتوں میں بیٹھ اُٹھ کر الٹا سیدھا عقیدۂ توحید ان سے لے لیتا ہے اور ایک ڈھانچا دین و مذہب کا کھڑا کر دیتا ہے، اپنی بدویت کو کیا کرے۔ اجزائے ترکیبی وہی رکھ دیے جو بادیہ گردوں کے لیے موزوں و مناسب ہو سکتے ہیں۔ غرض ایک بدوی نظام دین قائم کر دیا جس میں آمیزش مکہ کی، جو تجارتی قافلوں کا گزرگاہ تھا، شہریت و مدنیت کی بھی کر دی۔''

''کاش ہمارے ہاں کے مخلص و خیر اندیش لیکن چشم بند علماء کو اس کا اندازہ ہوتا کہ دین کو آج جن فتنہ سامانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کی نظیر ۱۴ سو سال کی تاریخ میں نہیں ملتی۔''[۲]

مستشرقین کی اس نوعیت کی فتنہ پردازیوں کا احساس عرب دنیا کے بعض اہم محققین کو بھی ہو چکا تھا۔ مثلاً ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم اور ممتاز مصری عالم اے ایل طباوی کو۔ سباعی نے استشراق کے سیاسی محرکات کے ضمن میں ایک بڑی اہم بات لکھی ہے کہ مستشرقین عام طور پر مشرق میں مغربی حکومتوں اور اقتدار کا ہراول دستہ رہے ہیں۔ مغربی حکومتوں کو علمی کمک اور رسد پہنچانا ان کا کام ہے۔ وہ ان مشرقی اقوام و ممالک کے رسم و رواج، طبیعت و مزاج، طریقِ بود و ماند اور زبان و ادب بلکہ جذبات و نفسیات سے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات فراہم کرتے ہیں تاکہ ان پر اہلِ مغرب کو حکومت کرنا آسان ہو۔

مولانا دریابادی کا ایک نہایت اہم مقالہ ''سیرتِ نبوی اور علمائے فرنگ'' ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے بعض معروف مغربی سیرت نگاروں مثلاً جارج فنلے، ولیم میور اور کارلائل کی تحریروں سے اعتنا کیا ہے اور ان کے اسلوب اور استدلال کی بعض کمزوریوں کو نمایاں کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ مستشرقین کی ایک قابلِ لحاظ تعداد حضور اکرمؐ کی سیرت کی تحسین کی اہل ہی نہیں۔ ان کی مادّی تربیت اور زمہریری عقل پرستی ایک خاص سطح اور ایک خاص مقام سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ مولانا ماجد کے نزدیک بعض مستشرقین بظاہر تو حضورؐ کے لائے ہوئے انقلاب کے قائل نظر

آتے ہیں لیکن وہ حضورؐ کو صرف اور صرف ایک غیر معمولی انسان اور ایک عظیم مصلح و مقنن کے روپ میں دیکھتے ہیں اور انھیں مامور من اللہ یا وحی الٰہی کے فیض یافتہ کے طور پر ماننے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے۔ چنانچہ ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد کمزور عقیدے کے مسلمان کے نزدیک حضورؐ کی حیثیت بجائے اللہ کے برگزیدہ اور سچے نبی کے محض ایک مخلص و نیک نیت مصلحِ وقت کی رہ جاتی ہے۔ مولانا چونکہ خود ایک عرصہ تک ان دوست نما دشمن مستشرقین کے دجل ودسیسہ کاری کا شکار رہ چکے تھے اس لیے وہ اس فریب کاری سے خوب آگاہ تھے۔ ان کے نزدیک حضور اکرمؐ کو اللہ کا برگزیدہ نبی سمجھنے کے بجائے انھیں صرف مصلح اور بطلِ اعظم سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے صوبے کے گورنر سے کہا جائے کہ حضور والا کے اختیارات کا کیا کہنا، آپ پٹواریوں سے بڑھ کر اختیارات رکھتے ہیں۔ لائیڈن یونیورسٹی کے تاریخ مذاہب کے پروفیسر ڈاکٹر کریمر سے بھی انھیں یہی شکوہ ہے کہ اس نے اپنی معروف کتاب ''World Cultures & World Religions'' میں حضورؐ کی دنیاوی کامیابیوں ہی کی تحسین کی ہے۔ اصل میں حضور اکرمؐ کو محض ایک عظیم سیاسی لیڈر قرار دینے والوں میں کئی اہم نام آتے ہیں۔ والٹیئر نے اپنی کتاب "Essai sur les moeurs et la` esprit des nations" (۱۷۵۶) میں ایک جگہ حضورؐ کا مقابلہ کرامویل سے کیا ہے اور انؐ کے کارناموں کو انگلستان کے اس نجات دہندہ سے عظیم تر قرار دیا ہے۔ صرف مادّی کامیابیوں پر نگاہ رکھنے والے ایسے ہی کوتاہ بینوں کو پیر رومیؒ نے مشورہ دیا تھا:

لفظ بگذاری سوئے معنی روی

مستشرقین میں سے بعض نے ہمارے ہاں قبول عام پایا ہے۔ انھی میں ایک نام کارلائل (۱۷۹۵-۱۸۸۱) کا بھی ہے جسے ہمارے بڑے بڑے علماء اور سیرت نگاروں نے ایک منصف مزاج مورخ کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ ایسے اہم لکھنے والوں میں سرسید اور شبلی بھی آتے ہیں اور سید سلمان منصور پوری بھی۔ کارلائل کی مشہور کتاب Sartor Resartus کے آخری حصے میں "On Heroes, Hero worship & the Heroic in History" کے زیرعنوان اس کے جو چھے لیکچر موجود ہیں، ان میں دوسرا لیکچر، "The Hero as Prophet Mahomet: Islam" کے عنوان سے شامل ہے۔ دراصل کارلائل اس بات کا قائل تھا کہ انسانی تاریخ عظیم انسانوں کے سوانح پر مشتمل ہے جس سے نوعِ انسانی فیض حاصل کرسکتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ممتاز شاعر اور بے مثل ڈرامہ نگار گوئٹے (۱۷۴۹-۱۸۳۲) سے شدید طور پر متاثر تھا جس نے اپنی ابتدائی زندگی میں حضور اکرمؐ کی سیرت سے متاثر ہوکر ایک شاعرانہ ڈرامے لکھنے کا آغاز کیا تھا جو نامکمل رہا۔ فلپ کے حتی کا کہنا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک انگریز اور فرانسیسی پروفیسروں کی ابتدائی کوششوں اور جرمن شاعروں اور عالموں کی مزید کمک کے نتیجے میں مسلم کلچر کے بارے میں تبدیلی واضح طور پر نظر آنے لگی تھی۔ کارلائل نے حضورؐ کی ذات کو ''نبی بحیثیت ہیرو'' کے حوالے سے منتخب کر کے ایک نئے رجحان ہی کی سمت نمائی نہیں کی تھی بلکہ اسے ایک سرعت اور تیز رفتاری بھی عطا کر دی تھی۸۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کارلائل کا مذکورہ بالا دوسرا لیکچر حضورؐ کی شخصیت کے بارے میں یورپ کے نہایت متعصّبانہ اور جارحانہ طرزِ عمل کے خلاف بہت حد تک ہمدردانہ ردِعمل اور ایک نہایت اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیکچر کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ کارلائل حضورؐ کی سیرت کا بہت حد تک ڈوب کر مطالعہ کرتا ہے اور ان کی عظمتوں کو خراج پیش کرنے میں فیاضانہ طرزِ عمل اختیار کرتا

ہے۔ وہ کہیں انھیں "Deep-hearted Son of Wilderness" کہتا ہے کہیں "genuine man" کہیں "The brother of us all" اور کہیں "The veritable Son of our common Mother"۔ کارلائل حضور کی سادہ سیرت کا دلپذیر نقشہ کھینچتا ہے، انؐ کی عمق رسی کی تعریف کرتا ہے اور انؐ کی تعلیمات کا نہایت سہل مگر دل میں اتر جانے والے اسلوب میں خلاصہ کرتا ہے۔ حضورؐ عرب مشرکین کو بت پرستی سے کیسے منع فرماتے تھے، اس کا ایک دلکش انداز کارلائل کے ہاں ملاحظہ کریں، جس میں کمال فصاحت و بلاغت کا لہو دوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

"Idolatry is nothing: these wooden idols of yours. Ye rub them with oil and wax and the flies stick on them,…….. these are wood, I tell you! They can do nothing for you, they are an impotent blasphemous pretence, a horror and abomination, if you knew them. God alone is; God alone has power; He made us, He can kill us and keep as alive: Allah akbar, God is great!" [۹]

یقین اور دردمندی کے جلو میں جذبے میں ڈوبے کارلائل کے اس ادب پارے کا اختتام ان سطور پر ہوتا ہے جو ''کار مرداں روشنی و گرمی است کی قوی برہان مہیا کرتی ہیں، اور ایقان کی عظمت کو آئینہ کرتی ہیں:

"The history of a Nation becomes fruitful, soul-elevating, great, so soon as it believes. There Arabs, the man Mahomet, and that one Century __ is it not as if a spark had fallen, one spark, on a world of what seemed black unnoticeable sand, but lo, the sand proves explosive powder, blazes heaven high from Delhi to Grenada! I said, the Great Man was always as lightning out of Heaven, the rest of men waited for him like fuel and then they too would flame" [۱۰]

مگر اس تمام تر دردمندی اور ہمدردانہ زاویۂ نگاہ کے باوجود اس خطبے میں کارلائل نے بعض مقامات پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ایسے ہی تسامحات کو مولانا دریابادی نے ''سیرت نبوی اور علمائے فرنگ'' میں نمایاں کیا ہے۔ مولانا دریابادی مستشرقین کو دو گروہوں میں بانٹتے ہیں اوّل پادری اور ان کی کھلی ہوئی گندہ ذہنی، دوم عام مصنفین اور اربابِ قلم۔ اس موخّر الذکر گروہ کو وہ مزید دو جماعتوں میں بانٹتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو پیغمبرِ اسلام کو کھلے الفاظ میں ''پیغمبرِ خادع'' کہتے ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے آپ کو انصاف، روا داری اور بے تعصبی کا مجسمہ ظاہر کرتے ہیں اور گویا پہلے گروہ کے جواب میں سیرت کے روشن پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ کارلائل کا شمار اسی آخری گروہ میں ہے جس نے حضور اکرمؐ کو اپنے وقت کا بڑا مصلح اور کامیاب مدبر قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ان پر نازل ہونے والی ربانی ہدایت یعنی قرآن حکیم کے اسلوب کے بارے میں اس طرح کی افسوس ناک رائے ظاہر کی ہے:

''متفرق اور منتشر جملے، ایک دوسرے سے غٹ پٹ، ایک ہی بات کی بار بار تکرار، پیچ در پیچ

الجھی ہوئی تقریر، مجمل اور مبہم، غرض بالکل مہمل.....کوئی یورپین سوا اس صورت کے کہ اسے فرض ادا کرنا ہو، سارے قرآن کو پڑھنے کا متحمل ہی نہیں ہوسکتا۔'' [۱۱]

مولانا لکھتے ہیں:

''ماشاءاللہ یہ ہے فرنگی داناؤں کے ایک دانا کی رائے، آپؐ کی اس کتاب سے متعلق جس کا ہم سرونظیر، معنوی ولفظی، ادبی واخلاقی، ہر حیثیت سے آج تک نہ دنیا کا کوئی صحیفہ ہوسکا نہ آئندہ ہوگا اور ظالم نے یہ رائے قائم کیوں کی، قرآن کو پڑھ کر نہیں، قرآن کے انگریزی ترجمے کو پڑھ کر جو کسی مسلمان کا نہیں ایک پادری کا کیا ہوا تھا اور پھر ترجمہ بھی براہ راست عربی سے نہیں بلکہ لیٹن ترجمے کا انگریزی ترجمہ اور خدا معلوم لیٹن کا ترجمہ بھی براہ راست تھا یا وہ بھی بالواسطہ تھا۔ یہ ہے دانایانِ فرنگ کی دانائی اور احساسِ ذمہ داری کہ واسطہ در واسطہ کا ترجمہ اور وہ بھی دشمن کے قلم سے.....مرعوب اور غلامانہ ذہنیت کا نوجوان مسلمان ان چیزوں کو پڑھ کر خود یہ سوچنے لگتا ہے کہ جب ایسے بڑے شخص اور اتنے بڑے محققِ عالی دماغ نے یہ رائے ظاہر کی ہے تو کچھ نہ کچھ اصلیت تو اس کی ضرور ہوگی.....اور یہی وہ فتنہ ہے جو ساری انگریزی تعلیم، انگریزی تمدن، انگریزی حکومت کے عقب میں مخفی ہے۔'' [۱۲]

کارلائل نے نہ صرف قرآنِ حکیم کے اسلوبِ بیان پر حرف رکھا بلکہ حضورؐ پر اترنے والی وحی اور اس کو لانے والے فرشتے کے بارے میں بھی تشکیک آفرینی کی ہے۔ کارلائل کا خیال ہے کہ جہل و ضلالت میں غلطاں صحرائے عرب کی تاریکی میں بالآخر وہ روشنی داخل ہوئی جو گومنتشر تھی مگر اس میں زندگی کی آسمانی جگمگاہٹ اور خیرگی شامل تھی۔ محمدؐ نے اسے وحی قرار دیا اور فرشتے کا نام جبرئیل رکھا.....بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بقول دریا بادی بظاہر حضورؐ پر کذب و بددیانتی کا الزام کہیں نہیں بلکہ خلوص وحسنِ نیت کا اعتراف لیکن اندر ہی اندر زہر پھیلتا چلا جارہا ہے اور حضورؐ کے دعوے کی تردید قدم قدم پر جاری ہے۔

یہ درست ہے کہ کارلائل نے خطبے کے آغاز میں حضوؐر کے لیے God-inspired، آگے چل کر ان کے پیغام کو ''"Heaven's message"'' قرار دیا ہے مگر نہایت کاریگری سے وحی کے بارے میں تشکیل دادہ اس کے مذکورہ ملفوف بیان کی تلافی مندرجہ بالا الفاظ وتراکیب سے نہیں ہوسکتی۔ حیرت ہے کہ فلپ کے حتّی نے کارلائل کی "Hero as a Prophet" کے بارے میں یہ جو لکھ ڈالا ہے کہ اس کی تعبیرات میں کوئی تکلیف دہ بات نہیں اور یہ کہ اس پر اگر تنقید ہوسکتی ہے تو صرف کہ یہ غیر تنقیدی ہے ''"Indeed it might be criticized for being uncritical"'' سو اس پر سوائے اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ خود حتّی کو کارلائل کے سحر کارانہ اسلوب کا تیز دھارا اپنے ساتھ بہالے گیا ہے اور وہ اس کے بعض بین السطور مضمرات کا پورا شعور حاصل نہیں کر پایا ہے۔ کارلائل کی برأت میں البتہ ایک بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ دیگر خطبوں کی طرح اس کے اس خطبے کے اوّلیں مخاطبین بھی مسلمان نہ تھے، وکٹورین سائنس سے بری طرح مرعوب اور مادہ پرست برطانوی اور یورپی حاضرین تھے۔ خود اس کا احساس بہت بعد میں جا کر مولانا دریا بادی

کو بھی ہو گیا تھا۔[۱۴]

مولانا دریابادی کا ایک معمول یہ بھی رہا کہ وہ اپنے ہفت روزہ ''صدق جدید'' میں وقتاً فوقتاً لائیڈن سے شایع ہونے والے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور اس کی نئی یا نظرثانی شدہ اشاعتوں پر اظہار خیال کرتے رہتے تھے اور جہاں ایک طرف اس علمی کارنامے کی تحسین کرتے تھے وہیں اس میں موجود علمی کمزوریوں یا تعصّبات کو بھی طشت از بام کرتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب مستشرقین کے تعصّبات میں کمی آ گئی ہے اور اس کے چند در چند اسباب میں ایک یہ بھی ہے کہ اب خود اہلِ مشرق میں فرنگی علم و تحقیق کی وہ مرعوبیت باقی نہیں رہی جو دو ایک پشت قبل تک قائم تھی۔ پھر اس تعدیل کا ایک بڑا سبب خود بعض مغربی دانشور مثلاً آرنلڈ، براؤن، راس، آربری اور حتّی اور ان کے نامور مسلم حریف امیر علی، عبداللہ یوسف علی، پکتھال، اقبال اور ڈاکٹر حمیداللہ وغیرہ رہے ہیں تاہم اس سب کے باوجود مولانا دریابادی کا خیال تھا کہ:

> ''اب بھی مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق- بدزبانیوں کا دور اب ختم ہو چکا ہے لیکن بدگمانیاں اب بھی دونوں کے درمیان بعدالمشرقین قائم رکھے ہوئے اور فاضل ایڈیٹروں اور ان کے نامیوں کی کوشش اب تک اس وضعداری کو نباہے چلی جارہی ہیں کہ پیام اسلام کی حقانیت، رسولؐ کی صداقت اور کلام مجید کے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق کا کوئی شائبہ بھی کسی مقالے سے نہ پیدا ہونے پائے اور اس سلسلے کے ہر واقعے کو توڑ موڑ کر مسخ و تلبیس کے ساتھ ہی پیش کیا جائے کہ پڑھنے والا جب کتاب بند کرے تو اپنے قلب و دماغ کو اسلام سے دور تر ہی پائے۔''[۱۵]

اس نتیجہ گیری کے بعد مولانا ماجد نے ''انسائیکلوپیڈیا آف اسلام'' کے نئے ایڈیشن کے ایک اندراج بعنوان ''آزر'' پر اس کے مصنف آرتھر جیفری کو ہدف تنقید بنایا ہے اور تالمود کے بعض مشمولات سے اس کی بے خبری اور بعض لسانی حقیقتوں سے اس کی چشم پوشی پر تأسّف کا اظہار کیا ہے۔

مولانا دریابادی کا مندرجہ بالا اقتباس آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ اس میں انھوں نے بدزبانیوں کے دور کے جس خاتمے کا ذکر کیا ہے، خلیجی جنگ اور نائن الیون کے بعد اب ان میں پھر ایک نئی قوت، شدت اور تیزی آ گئی ہے۔ آخر کلنٹن بینٹ Bennett کی "In Search of Historical Mohammad" اور پیٹریشیا کرون کی ''"Hagarism"'' کی زہر چکانی کو کیسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے؟[۱۶]

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں اجمالاً ایک ایسی کتاب کا ذکر کر دیا جائے جو مسلم علمی و ادبی حلقوں میں خصوصی ذکر کی مستحق ہے اور جسے جرمنی میں انگریزی اور امریکی ادب کے استاد ای اَن آمنڈ IAN ALMOND نے "The New Orientalists" نے زیرعنوان ۲۰۰۷ء میں انگلستان سے شایع کیا ہے۔ اس کتاب میں آمنڈ نے نٹشے سے لے کر دریدا، میشل فوکو، ژاں بادر لارد JEAN BAUDRILLARD ، جولیا کرسٹیوا، بورخیس، رشدی اور اورہان پامک وغیرہ کی تحریروں کا جائزہ لے کر ان کے یہاں مستعمل مسلم مشرق کے علائم و استعارات اور ان کے تناظر میں جدیدیت پر

تنقید کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس نے اسلام اور عرب دُنیا کے بارے میں ان مابعد جدید دانشوروں کے ہاں پائے جانے والے مفروضات، متروکات اور تعصّبات کا جائزہ لیا ہے اور اس باب میں ضیاء الدین سردار، عزیز الاعظمی اور بوبی ایس سید سے استفادہ کر کے اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔ یہاں کتاب کے تمام مشمولات کے ذکر کا تو موقع نہیں صرف دریدا Derrida کے اسلام کے بارے میں تاثرات کا اجمالی ذکر بے موقع نہ ہوگا گو کہ مصنف نے آغاز ہی میں کہہ دیا ہے کہ دریدا کی تحریروں میں اسلام مرکز میں نہیں محض حاشیے میں جگہ پا سکا ہے۔ آمنڈ کے خیال میں دریدا کے ہاں اسلام کہیں تو یہودیت اور عیسائیت کے ایک حصہ دار کے طور پر توحید کے علمبردار کے طور پر ظہور کرتا ہے اور کہیں مغربی جمہوریت کے بالمقابل ''عربِ بیگانہ'' کی حیثیت سے اور تشدد اور جنونیت کے ذخیرے کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ اپنی کتاب Faith & Knowledge میں دریدا "Islam as Brother & Islam as Other" کے تضاد اور ثنویت کے مابین جھولتا نظر آتا ہے۔ ستم یہ ہے کہ دریدا کے نزدیک تینوں ابراہیمی مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام اس بنا پر مذاہب کتاب Religions of the Book نہیں کہ یہ تینوں وحی کے فیض یافتہ ہیں بلکہ اپنے خارجی مراسم و خصائص کی وجہ سے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ کہیں کہیں وہ بقول مصنف اسلام کی واضح انفرادیت پر بھی زور دیتا ہے اور یورپیوں کے لیے اسلام کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> "For, We Europeans" a phrase Derrida employs with not completely convincing irony, Islam brings out the worst in us and it is precisely this process that Derrida finds so necessary to our self-understanding."[۱۷]

گویا مغربیوں کو اپنے باطن میں غوطہ زن ہو کر اپنے تاریک منطقوں کی نشاندہی کے لیے اسلام کی ضرورت ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے مابعد جدیدی خیالات سے مجبور ہو کر اور تکثیریتِ خیال'' کا حامی ہونے کے باعث دریدا ''متعدد اسلاموں'' پر بھی اصرار کرتا ہے جو دراصل روحِ اسلام سے اس کی عدم آگاہی کا مظہر ہے مگر اس کے فلسفۂ تکثیریت کے عین مطابق!

کہنا یہ ہے کہ آج کی مغربی دُنیا میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر گفتگو اور بحث مباحثے کا ایک طوفان اٹھا ہوا ہے۔ ہم اہلِ اسلام کا فرض بنتا ہے کہ اسلام کے آفاقی پیغام کو حکیمانہ انداز میں اس کی اصل عالمی اور احترام پسندانہ روح کے ساتھ اہلِ عالم کے سامنے پیش کریں۔ مکالمے اور بین المذاہب گفتگو کے رستے کھولیں اور اسلام کی حرکی روح سے استفادہ کر کے ایجاد، اختراع اور تسخیر فطرت کو اپنا ہدف بنا کر وہ وقار اور اعتماد حاصل کرنے کی سعی کریں جس سے ہم من حیث الملّت اس وقت محروم ہیں۔ ہم مغربی استعمار کی استشراقی چالوں کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم مغرب کی سی بے قرار روحِ علمی سے بہرہ ور نہیں ہو جاتے اور علوم و فنون اور السنہ کے بحرِ ذخّار میں اہل مغرب کی طرح غوطہ زن نہیں ہو جاتے۔ ایسے میں مولانا دریابادی کے ایسے علماء کی تحریریں ہمارے لیے مشعل راہ کا کام دیتی رہیں گی۔ آج مسلم دنیا کو ایک نئے علمی منہاج کی شدید ضرورت ہے جس کی بنیاد توحید، وسیع النظری اور نامختتم آرزومندی پر رکھی گئی ہو جب کہ فی الوقت ہماری حالت اکبر کے اس شعر کے مصداق ہے:

تھی شب تاریک، چور آئے جو کچھ تھا لے گئے
کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

حواشی:

۱۔ راقم نے یہ معلومات پروفیسر ظفر علی قریشی کی قابلِ قدر کتاب، ۱۹۹۲ء، "Prophet Mohammad & His Western Critics" سے اخذ کی ہیں۔ ر-ک کتاب مذکور جلد اوّل، ص: ۳

۲۔ دیکھیے "Islam the Alternative"، ۲۰۰۰، (مراد ہوفمین) کا دیباچہ ص: xiii

۳۔ Mohammadanism. p. 30

۴۔ ''سچ''، ۲/اگست ۱۹۲۶ء، ص: ۳

۵۔ صدقِ جدید، ۱۵/اکتوبر ۱۹۶۳ء، ص: ۸

۶۔ صدقِ جدید، ۷/اکتوبر ۱۹۶۶ء، ص: ۵، ۶

۷۔ تفصیل کے لیے دیکھیے صدقِ جدید ۵/مئی ۱۹۶۷ء میں مولانا کا شذرہ بعنوان: ''سیرتِ نبوی اور کج نظری''۔

۸۔ ''Islam and the West''، ۱۹۶۲ء، Anvil، ص: ۶۱

۹۔ Sartor Resartus، ص: ۳۱۸

۱۰۔ ایضاً، ص: ۳۳۲

۱۱۔ سلطانِ ما محمدؐ، ۲۰۰۶ء، بار سوم، ص: ۹۹

۱۲۔ ایضاً، ص: ۹۹

۱۳۔ Islam and the West، ص: ۶۱

۱۴۔ اس ضمن میں ان کا شذرہ بعنوان ''سچی باتیں'' صدقِ جدید، شمارہ یکم نومبر ۱۹۶۳ء ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جس میں کارلائل کے ساتھ ساتھ ڈچ مستشرق DeJoeje، گوئٹے، آرنلڈ اور فلپ کے حتّی کے اسلام اور پیغمبر اسلام کے باب میں ہمدردانہ موقف کی خوب تحسین کی گئی ہے۔

۱۵۔ صدق جدید لکھنؤ، ۱۲/دسمبر ۱۹۵۸ء، ص: ۴

۱۶۔ ان دو کتب کی نشاندہی کے لیے میں اپنے فاضل دوست ڈاکٹر مظفر اقبال کا ممنون ہوں۔

۱۷۔ The New Orientalists، ۲۰۰۷ء، ص: ۵۹

II